© rasailojaraid.com

میر کی اخلاقی قدریں

(جناب لکشمی نرائن وششٹ تابش ایم - اے - بی - ایڈ)

اخلاق اور مذہب کا گہرا تعلق ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر مذہب کا اخلاق جداگانہ ہوتا ہے - اس کا مفہوم یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد اخلاق پر قایم ہے - مذہب کا مقصد انسان کو با اخلاق بنانا ہے تاکہ وہ اس دنیا میں رہ کر بہتر زندگی بسر کر سکے ، خود جئے اور دوسروں کو جینے دے - یہی وجہ ہے کہ ظاہر اطور پر مذاہب جدا جدا ہیں لیکن ان کی اخلاقی قدریں جداگانہ نہیں - وہ آفاقی ہی نہیں بلکہ لامکانی ہیں بقول شخصے شاعری کا مقصدِ اولین اخلاقی قدروں کی اشاعت ہے - اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شاعری صحیح معنوں میں شاعری کہلانے کی مستحق نہیں جو اُن اخلاقی قدروں کو فروغ نہ دے اگر شاعری کا اصل مقصد یہی سمجھ لیا جائے تو موجودہ شاعری کا بیشتر حصہ نذرِ آتش کر دینا پڑے گا -

ایک زمانہ تھا جب عرب میں شاعری کا خوب چرچا تھا اور عرب کے عوام اپنے اس خداداد عطیہ پر اس قدر نازاں تھے کہ انھوں نے ساری دنیا کو اپنے سامنے گونگا (عجم) سمجھا مگر قرآن شریف میں واضح طور پر یہ بات بتا دی گئی ہے کہ پیغمبرِ اسلام شاعر نہیں تھے ، وہ پیامبر تھے اس کے باوجود قرآن شریف ہر معنی میں شاعری کا مکمل ترین نمونہ سمجھا جاتا ہے - یہاں کچھ ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن پر مکمل تحقیقات کی ضرورت ہے جیسے شاعری اور موسیقی ، تخئیل اور موسیقی ، الفاظ اور موسیقی اور ان سب کا باہمی تعلق -

نفسیات کا ایک اصول یہ ہے کہ کسی انسان کے ذہنی ارتقار کی کڑیاں گننے کے لئے اُس کی زندگی کے مختلف ادوار کا جائزہ لینا ضروری ہے - یہ جائزہ ہر دور کے لئے مختلف ہو گا اور ان دوروں میں اہم ترین دور اوائل عمر کا سمجھا جاتا ہے - ماحول کا جو اثر اس دور میں کسی انسان کے ذہن پر پڑے گا وہ نقوش ذہن پر عمر بھر مرتسم رہیں گے اگر اس نظریہ کے مطابق میر کی زندگی کو دیکھا جائے تو اُن کا بچپن اُس عہد کے لحاظ سے اچھی طرح بسر ہوا تھا - دس سال کی عمر میں پہلی بار انھیں دنیا کی تلخیوں سے دوچار ہونا پڑا - یہ دس سال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کس طرح گذرے اس کا اندازہ "ذکر میر" کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ والدین کی محبت سے زیادہ انھیں اپنے منھ بولے چچا (امان اللہ) کی محبت حاصل تھی۔ میر کو غالباً اپنے والد بزرگوار کے مرنے کا اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا کہ عم بزرگوار کے انتقال کا۔ میر کے ابتدائی دس سال اسی بزرگ کی صحبتوں میں گذرے۔ اس زمانہ میں ان کی ننھی آنکھوں نے عشق حقیقی کے وہ مناظر دیکھے، اخلاق کی وہ تجلیاں دیکھیں، اور ان کے خام ذہن نے فلسفۂ تصوف کے ان رازوں کو کھولنے کی مقدور بھر کوشش کی جو سعدی شیرازی کو چالیس سال کی عمر عزیز گذارنے کے بعد میسر ہوئے۔ ان کے والد نے انھیں عشق کی تلقین کی اور یہ اُسی کا اثر ہے کہ انھوں نے عشق پر کافی لکھا ہے۔ یکایک ان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور انھیں دُنیاوی زندگی کے نشیب و فراز کا احساس ہوا۔ اپنے پرائے ہوگئے، محبت، نفرت میں تبدیل ہوگئی اور مجبوراً انھیں وطن کو خیرباد کہنا پڑا جیساکہ "ذکر میر" میں لکھا ہے:

"جو لوگ درویش کی زندگی میں میری خاکِ پا کو ——— سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے اب انھوں نے مجھ سے آنکھیں چرالیں"۔

میر کی زندگی کا یہ واقعہ ایسا سانحہ ہے جو اخلاق کی کسوٹی کہا جا سکتا ہے۔ اس پر انھوں نے اپنوں اور پرایوں اور عزیز و اقارب کے اخلاق کو پرکھا، اپنے اس ماحول کی آزمائش کی جس میں انھوں نے دس سال گذارے تھے، اُن آشناؤں اور بیگانوں میں سے انھیں ایک ہمدرد نظر آیا اور انھیں اپنی مختصر سی دنیا میں فقط ایک ستارہ جگمگاتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ والہانہ اس کی طرف بڑھے مگر راستے میں خطرے حائل ہوئے۔ میر کی نظروں میں اُس ستارے کی۔ تابناکی عمر بھر جگمگاتی رہی اور یہی نور ان کی عشقیہ شاعری کی روح ہے۔ ذوق کا شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے ‌ ‌ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میر گھبرا کر اُس مختصر سی دُنیا سے نکلے مگر انھیں اس کا کیا علم تھا کہ وہ باہر کی وسیع و عریض دنیا میں بھی سکون کو ترستے رہیں گے۔ آگرہ سے باہر نکلنے کے بعد میر صاحب کو زندگی کے جو تلخ تجربات ہوئے "ذکر میر" میں ان کے ثبوت موجود ہیں۔ مصائب و آلام کا یہ سلسلہ جو اُس عہد کی تاریخی خصوصیت بن چکا تھا اخیر عمر تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میر کے ساتھ رہا۔ اُس نے ان کے ذہن میں اخلاق کا ایک مخصوص فلسفہ پیدا کر دیا اور اس کے ساتھ ہی دل کو تسکین دینے کے لئے حقیقتاً یہ نتیجہ نکالا کہ انسان کے اندر پختگی اور وسیع الخیالی اُسی وقت آتی ہے جب وہ ساری دنیا کو دیکھے بھالے یعنی اس کا بغور مطالعہ کرے۔ گھر پر بیٹھ کر انسان تجربہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے اُسے ہر قسم کے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے اور دور دور کا سفر کرنا پڑتا ہے کیوں کہ تجربہ سے ہی انسان بنتا ہے اور اُسی وقت اس کے اندر روشنی پیدا ہوتی ہے جو اُسے ہر اونچ نیچ سے آگاہ کرتی ہے ؎

پختہ کاری کے تئیں سفر ہے شرط — خامی جاتی ہے کوئی گھر بیٹھے

شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

تا بہ دکان خانہ در گروی — ہرگز اے خام آدمی نشوی

فارسی کے ایک اور شاعر نے اس طرح کہا ہے ؎

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے — صد تجربہ شد حاصل در راہ بہر گامے

اور یہیں سے ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ انسان کی عزت اس کے اپنے نہیں بلکہ پرائے کرتے ہیں، وطن میں نہیں بلکہ باہر اس کی عزت ہوتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ انسانی فطرت ہو۔ اس لئے کہ تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ میر نے مشہور تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا ہے ؎

عزت کسو کی ہوتی نہیں ہے وطن کے بیچ — کنعاں سے جا کے مصر میں یوسف ہوا عزیز

پاکیزہ گوہروں کی عزت نہیں وطن میں — یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا

منشی چندر بھان کیفی دہلوی کہتے ہیں ؏

اہلِ ہنر کی قدر وطن میں ذرا نہیں

کسی کا مشہور شعر ہے ؎

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا — عزت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا

اخلاق کی سب سے پہلی چیز شاید انسانی عظمت ہے یعنی انسان کی پیدائش کا مقصد اور اس کا منات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اس کی صحیح اور مناسب جگہ۔ اس مسئلہ کے ساتھ ساتھ انسان کے خالق کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ میر کے سامنے انسان کی بزرگی اور فضیلت کا وہ فلسفہ تھا جو قرآنِ کریم میں پیش کیا گیا ہے لیکن اس نظریہ پر تصوف کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ قرآنِ کریم میں صاف طور پر انسان کو اشرف المخلوقات ہی نہیں بلکہ خدا کا نائب بتایا ہے۔ چنانچہ میر انسانی عظمت کے قائل ہیں۔ ذیل کے اشعار اس بات پر دال ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے تھے بہم تب ہم — برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا
یہ مشتِ خاک یعنی انساں ہی ہے رو کش — ورنہ اٹھائی کن نے اس آسماں کی ٹکر
پھر نہ شیطاں سجودِ آدم سے — شاید اس پردے میں خدا ہووے
کھینچا ہے آدمی نے بہت دور آپ کو — اس پردے میں خیال تو کر ٹک خدا نہ ہووے
آدمی سے ملک کو کیا نسبت — شان ارفع ہے میر انساں کی
آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے، ورنہ — آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا
تھوڑے میں دور کھینچے ہے کیا آدم آپ کو — اس مشتِ خاک کا تو دماغ آسمان پر
باوجودِ ملکیت نہ ملک نے پایا — وہ تقدس کہ جو ہے حضرتِ انساں کے بیچ
برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں — تب کوئی ہم سا صاحبِ صاحب نظر بنے ہے
ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں — مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا
کہیں نسلِ آدمی کی اٹھ نہ جاوے اس زمانے میں — کہ موتی آبِ حیواں جانتے ہیں آبِ انساں کو
برسوں گئی جب ہم نے تردد کئے ہیں تب — پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو

لیکن انسانی جامہ مل جانے سے ہی انسان نہیں بن جاتا۔ اس میں انسانی خوبیاں ہونا بھی لازمی ہیں۔ میر کہتے ہیں ؎

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال — آدم نہیں ہے، صورتِ آدم بہت ہے یہاں

اور یہ حقیقت ہے کہ صحیح معنوں میں آدمی بننا بڑا مشکل ہے۔ میر نے اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے مَلک ـــــ آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں

بیاںؔ یزدانی میرٹھی نے بھی کہا ہے ؎

اے بیاںؔ سہل ہے ہم رنگِ ملائک ہونا — آدمی بنتا ہے انسان بڑی مشکل سے

لیکن ـــــ اگر اپنے آپ کو خدا سمجھ لے تو سماج کی کیا حالت ہو؟ اس کا اندازہ مشہور صوفی منصورؔ کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ انسان اور خدا کا تعلق انفرادی ہو سکتا ہے اجتماعی نہیں۔ انسان کی تخلیق میں ان سب باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ انسان کے ساتھ آرزو کا کانٹا ایسا لگا دیا گیا ہے کہ اس سے اس کا دامن بُری طرح اُلجھا ہوا ہے میرؔ فرماتے ہیں ؎

برنگِ بوئے غنچہ عمر اک ہی رنگ میں گزرے — میسّر میرؔ صاحب گر دلِ بے مدعا آوے

جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی — ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو — وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

کسی نامعلوم شاعر کا شعر اسی ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے ؎

ہم خدا تھے گر نہ ہوتا دل میں کوئی مدعا — آرزوؤں نے ہماری ہم کو بندہ کر دیا

اور یہ تمنائیں انسان کی خصوصیات ہیں۔ حیوانات میں بھی خواہشات پائی جاتی ہیں لیکن انسانی اور حیوانی خواہشات میں سب سے بڑا فرق اُن خواہشات کے تسکین کے ذرائع کا ہے۔ حیوانی خواہشات اپنے پورا ہونے کے لئے کچھ نہیں دیکھتیں۔ وہاں جس طرح بھی ہو خواہشات پوری کر لی جائیں یہی مدنظر رہتا ہے لیکن انسانی خواہشات پر عقل کا تسلط ہوتا ہے اور یہی عقل اخلاق کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس سماج میں ایک انسان نہیں رہتا، پوری نسلِ آدم اس کے اجزا ہیں۔ اس لئے انسان کو اپنی خواہشات کی تسکین ڈھونڈتے وقت دوسروں کی خواہشات کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔

اس دُنیا میں دولت کے بغیر زندگی مکمل نہیں اور شاید قدرت کا بھی یہی منشاء ہے اور حقیقت میں اسی سے دنیاوی عزت قایم ہے ؎

دیکھ گل کو ٹک کہ جو یک سر چڑھا لیتا ہے یہاں — اس سے پیدا ہے کہ عزت اس چمن میں زر سے ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظیر اکبر آبادی نے بھی کیا خوب فرمایا ہے ؎

پیسہ ہی رنگ و روپ ہے، پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

لیکن سماج میں جتنے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں وہ سب اسی "زر" کی تقسیم سے ہوتے ہیں اور بائبل میں آیا ہے کہ "دولت سب برائیوں کی جڑ ہے۔" اس لئے لوگوں نے اخلاقی طور پر دولت کو اہمیت نہ دے کر صبر و قناعت کو بہتر قرار دیا ہے۔ میر صاحب قلندرانہ زندگی گذارنے کے حق میں ہیں جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

تھا میر عجب فقیر، صابر، شاکر
ہم نے اس سے کبھو شکایت نہ سُنی

ہو سکتا ہے کہ یہ ایک قسم کی افیون ہو جو عوام کو سُلانے کے لئے دی گئی ہو جیسا کہ کچھ ترقی پسندوں کا خیال ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس توکل سے ایک عجیب و غریب قسم کی راحت ملتی ہے۔ میر صاحب نے جا بجا توکل کا ذکر کیا ہے ؎

نہ کیوں کہ شیخ توکل کو اختیار کریں
زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں

غیرت ایک ایسی خوبی ہے جو ہر انسان کے اندر ہونی چاہیئے اگر حق پوچھا جائے تو یہی عزت کی بُنیاد ہے اور وہی انسان مرد کہلانے کا مستحق ہے جو غیرت جیسی صفت سے متصف ہو ؎

واصل بہ حق ہوئے نہ جو ہم جانے مر گئے
غیرت ہو کچھ مزاج میں جس کی وہ مرد ہے

یہاں بھی غیرت کا سبق دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وا نسیم صبح سے ہوتا ہے گُل
تجھ کو اے مُرغِ چمن غیرت بھی ہے

جاناں ہے بار تیغ بہ کف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا

غرور ایک ایسی زبردست انسانی کمزوری ہے جو اسے کسی بلند مرتبہ تک پہنچنے نہیں دیتی۔ اس لئے اسے ترک کرنا ہی لازم ہے۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

کیا آسماں پہ کھینچے کوئی میر آپ کو
جانا جہاں سے سب کو مسلم ہے زیر خاک

مت ہو مغرور اے کہ تجھ میں زور ہے
یہاں سلیماں کے مقابل مور ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی کیا زیرِ فلک دیکھا کرے فرقِ غرور — ایک پتھر حادثہ کا آ لگا، سر جھک گیا

میر صاحب جیسے خود دار انسان کے لئے احسان اٹھانا موت کا پیغام تھا اور حقیقت یہ ہے کہ احسان نہ اُٹھانا ایک ایسی خوبی ہے جو خود داری کا جذبہ پیدا کرتی ہے ؎

بہت چاہا تھا ابرِ تر نے لیکن — نہ منت کش ہوا گلشن ہمارا

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو — جاہ و ثروت کا میسر سر و ساماں نہ ہوا

شکر صد شکر کہ ہیں ذلت و خواری کے سبب — کسی عنوان میں ہم چشمِ عزیزاں نہ ہوا

ذوق کا مشہور شعر ہے ؎

احسان ناخدا کا اُٹھائے میری بلا — کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں

جو رضائے الٰہی ہوتی ہے وہ ہر حالت میں ہو کر رہتی ہے۔ دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اسے نہیں روک سکتی۔ ہونی اور شدنی عام مشہور ہے ؎

ہم میر ترا مرنا کیا چاہتے تھے لیکن — رہتا ہے ہوئے بن کب، جو کچھ کہ ہوا چاہے

جس انسان کا دل "حرص و ہوس" سے پاک ہوتا ہے وہی اچھا کہلاتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ لالچ بُری بلا ہے اور اس میں پھنس کر انسان اپنے دین و ایمان کو گنوا بیٹھتا ہے ؎

حرص و ہوس سے باز رہے دل تو خوب ہے — ہے قہر اس کلی کے تئیں گر ہوا لگے

ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز — وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

انسانی خود غرضی مشہور ہے اس واسطے ہر چیز خُدا سے ہی طلب کرنی لازم ہے ؎

میر بندوں سے کام کب نکلا — مانگنا ہے جو کچھ خُدا سے مانگ

داغ فرماتے ہیں ؎

داغ کو، کون دینے والا تھا — جو دیا اے خُدا دیا تو نے

بے نیازی اور عاجزی بڑی خُوبیاں ہیں جو طرح طرح کی ذلتوں سے انسان کو بچاتی ہیں، ان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل کرنے کے واسطے کڑی ریاضت کرنا پڑتی ہے اور دل پر قابو پانا پڑتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میر نے اپنے آپ کو بندہ، حقیر، احقر اور ہیچمداں لکھا ہے ؎

آگے جواب ہے اُن لوگوں کے بارے معافی اپنی ہوئی ۔۔۔ ہم بھی فقیر ہوتے تھے لیکن ہم نے ترکِ سوال کیا

ہم سے بغیر عجز کبھو کچھ بنا نہ میر ۔۔۔ خوشحال وہ فقیر کہ جو بے نیاز ہو

خودداری انسانی جوہر ہے ؎

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش ۔۔۔ ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

جو، اس شور سے میر روتا رہے گا ۔۔۔ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

اور ــــــ آخر کار یہ "سرمایۂ توکل" خدا کا نام بن جاتا ہے ؎

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا ۔۔۔ سرمایۂ توکل یاں نام ہے خدا کا

جن لوگوں کو اس دنیاوی زندگی میں سکون اور راحت نہیں ملتی وہ اپنا دل خوش کرنے کے لئے کچھ آخرت کے فلسفے گھڑ لیتے ہیں اور اسی تصور میں، کہ ان مصیبتوں کو اٹھا کر موت کے بعد شروع ہونے والی دنیا میں سکون اور آرام ملے گا، ہنسی خوشی مصیبتوں کا سامنا کر لیتے ہیں۔ اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ عاقبت کی فکر کرنا دور اندیشی ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

فکر کر زادِ آخرت کا بھی ۔۔۔ میر اگر تو ہے عاقبت اندیش

توشۂ آخرت کا فکر رہے ۔۔۔ جی سے جانے کا ہے سفر نزدیک

یہی وہ مقام ہے جہاں مذاہب پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ عوامی ذہن کے لئے افیون ہے اور یہ اُن کی صلاحیتوں کو سُلا کر تصور میں لطف حاصل کرنا اور انجان مستقبل کا منتظر رہنا سکھا دیتے ہیں۔

میر کی زندگی آفتوں میں کٹی، انھیں دولت کے سہارے ملے مگر وہ سب عارضی ثابت ہوئے۔ ان کے ماحول میں یہ اضطراری کیفیت ناگزیر جزو بن چکی تھی۔ اسی لئے میر کا فلسفۂ اخلاق توکل کے گرد گھومتا نظر آتا ہے اگر میر کو زندگی میں آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ مل جاتا اور وہ آمدنی ان کے لئے کافی ہوتی تو کلیاتِ میر میں توکل کا لفظ بھی نہیں ملتا اور آج وہ موجودہ میر نہ ہوتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہراً نیکی کا بدلہ بدی ملتا ہے اور یہ بات روز دیکھنے میں آتی ہے کہ اگر کسی کے ساتھ بھلائی کی جائے تو اس کے عوض میں برائی ملتی ہے۔ میرؔ اس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

ہر آن کیا عوض ہے دعا کا بدی دیئے
تم کیا کرو بھلے کا زمانہ نہیں رہا

بدی نتیجہ ہے نیکی کا اس زمانہ میں
بھلا کسو سے جو کرتا تو تو بُرا کرتا

منصور کی حقیقت تم نے سُنی ہی ہوگی
حق جو کہے ہے اس کو یہاں دار کھینچتے ہیں

"انوار سہیلی" میں اژدہے اور اونٹ سوار کی مشہور کہانی بھی اسی بات کی غمازی کرتی ہے کہ بھلائی کا بدلہ برائی ملتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ نیکی بذاتِ خود ایک ایسی اچھائی ہے جو لافانی حیثیت رکھتی ہے۔ نیک کام کا انجام ہمیشہ نیک ہی ہوگا اس لئے میرؔ نیکی کو اختیار کرنے اور بدی کو ترک کرنے کی تلقین کرتے ہیں ؎

رہتی ہے سو نکوئی، رہتا نہیں ہے کوئی
تو بھی جو یہاں رہے ہے تو زنہار مت بدی کر

مذہب ایک ایسی روشنی ہے جس کی مدد سے ہم پُرپیچ راستوں سے بے خوف و خطر گذر جاتے ہیں۔ مذہب سچائی کا نام ہے۔ ہر مذہب کا ایک اپنا مسلک ہوتا ہے لیکن ہر مذہب کی بنیادی باتیں مشترک ہوتی ہیں اور پہنچنا سب کو اُسی خدا تک ہے اس لئے بلند نظری اور وسیع الخیالی سے کام لینا چاہیئے۔ میرؔ صاحب کا مذہب انسانیت ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے علمبردار ہیں، وہ مذہبی "رسوم و قیود" سے بالاتر ہیں۔ مذہبی رواداری ان کا ایمان ہے۔ اسی لئے وہ ہندو مسلم تفرقات کو فضول بتاتے ہیں۔ مذہبی اختلافات کی بنا پر فساد کرنا واقعی نری حماقت ہے ؎

مذہب سے میرؔ کے کیا تجھے میرا دیار اور
میں اور یار اور مرا کاروبار اور

میرؔ کے دین و مذہب کی کیا پوچھو ہوں نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم، کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر
دیر ہو یا کعبہ، مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے

راہ سب کو ہے خدا سے، جان اگر پہنچا ہے تو
ہوں طریقے مختلف کتنے ہی منزل ایک ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف، کہیں رُخ نہ دکھا
اختلاف آیا نہ ہندو و مسلمان کے بیچ

مسلم و کافر کے جھگڑے سے ہیں جنگ و جدل سے رہائی نہیں
لوتھوں پہ لوتھیں گرتی رہیں گی، کٹتے رہیں گے سر کے سر

جب میرؔ اپنے عم بزرگوار امان اللہ کے ساتھ بایزید سے ملنے گئے تو انھوں نے یہ نصیحت کی کہ اگر مقصود تک پہنچنا چاہتے ہو تو کسی کے دل میں راہ کرو۔ چنانچہ یہ اشعار اسی کی صدائے بازگشت معلوم دیتے ہیں کہ کعبہ اور کاشی جانے سے انسانی مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جب تک کسی دل میں راہ پیدا نہ کی جائے ؎

کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ
سعی کر ٹک پہنچ کسی دل تک

کعبے سو بار وہ گیا تو کیا
جس نے یہاں ایک دل میں راہ نہ کی

دیر و حرم سے گذرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلہ پر سیر و سفر ہمارا

میرؔ کی نگاہ میں بلندی ہے اور تنگ نظری نام کو نہیں۔ ان کی نظر میں اونچ نیچ سب یکساں ہیں۔ چنانچہ جلوۂ ربانی دیکھنے کے لئے خاص و عام کی پابندی نہیں اس کی تجلی سے ہر خرد و کلاں لطف اندوز ہو سکتا ہے اور اس کے دروازے سب پر بلا امتیاز یکساں کھلے ہوئے ہیں ؎

عام ہے یار کی تجلی میرؔ
خاص موسیٰ و کوہِ طور نہیں

کسی چیز کے اصلی جوہر اس کی متضاد چیز سے ظاہر ہوتے ہیں ؎

کفر کچھ چاہیئے اسلام کی رونق کے لئے
حسن زنار ہے تسبیحِ سلیمانی کا

قائمؔ کا یہ شعر اسی ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے ؎

موقوف ضد ہی پر ہے ہر شے کی معرفت
کچھ کفر بھی ضرور ہے اسلام کے لئے

انسانی قدر و منزلت جدا ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے ؎

پچھتاؤ گے بہت جو گئے ہم جہان سے
آدم کی قدر ہوتی ہے ظاہر جدا ہوئے

خاموشی ایک ابدی سچائی ہے جس کی قدر و قیمت مسلم ہے۔ اس میں وقار پوشیدہ ہوتا ہے ع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہے وقار

ہر چیز میں خلوص کی ضرورت ہے ؎

اخلاصِ دل سے چاہیئے سجدہ نماز میں — بے فائدہ ہے ورنہ جو یوں وقت کھوئیے

میر نے قلبیہ واردات اور کیفیات کی جو سچی تصویریں کھینچی ہیں وہ بے مثال ہیں۔ صاف گوئی انھیں اچھی لگتی ہے اور اسی واسطے انھوں نے اس خوبی پر زور دیا ہے ؎

کہنا جس سے جو کچھ ہو گا سامنے میر کہا ہو گا — بات نہ دل میں پھیر گئی ہو گی منہ پر میرے آئی ہوگی

اور یہ حقیقت ہے کہ میر نے جو کچھ کہا منہ در منہ کہا اور کھلے بندوں کہا۔

اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے ؎

چشمِ مست اپنی سے صحبت نہ رکھا کر اتنی — بیٹھئے کبھی تو کبھلا مردمِ ہشیار کے پاس

دنیائے فانی میں کیا کسی سے لڑنا اور جھگڑنا ہے۔ سب کے نرم گرم اٹھانا چاہیئے، ہر ایک سے اچھا سلوک رکھنا چاہیئے اور کسی کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیئے یعنی زندگی اس طرح گذارنی ضروری ہے کہ خود دوسرے پر بوجھ ثابت نہ ہو ؎

چار دن کا ہے مجہلہ یہ سب — سب سے رکھئے سلوک ہی ناچار

کسی ایک فن میں کامل مہارت حاصل کرنا انسانی زندگی کا مقصد ہے اور اس کے واسطے ہمت کی ضرورت ہے ؎

عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا — آدمی ہووے کسی پیشہ میں جرأت چاہیئے

حالی نے کہا ہے ؎

کمالِ کفش دوزی علمِ افلاطوں سے بہتر ہے

انسان اُسی وقت مشہور اور نامور ہو سکتا ہے جب وہ مستقل طور پر اپنا ٹھکانہ بنا لیتا ہے اور ایک ہی جگہ جم کر بیٹھ جاتا ہے جیسا کہ انگریزی کی مشہور کہاوت بھی اسی حقیقت کو جتلاتی ہے :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میر صاحب فرماتے ہیں ؎

نہ اُٹھ تو گھر سے اگر چاہتا ہے ہوں مشہور   نگیں جو بیٹھا ہے گڑ کر تو کیسا نامی ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ گیا ہوا وقت واپس نہیں آتا اور ظاہر ہے کہ وقت بڑی قیمتی چیز ہے اس لئے جو وقت باقی رہ گیا ہے اُسی کو غنیمت جان کر مستعدی اور نیک نیتی سے ہر کام کرنا چاہیئے کیوں کہ انسانی زندگی چندروزہ ہے

گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب، ہوئے ہیں گنوا کے خراب سب   تجھے کرنا ہووے سو کر تو اب کہ یہ عمر برق شتاب ہے

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز   میر اس کو رائگاں کھوتا ہے کیوں

خواجہ میر درد کا پر معنی شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

بے فائدہ انفاس کو ضائع نہ کرلے درد   ہر دم دمِ عیسیٰ ہے تجھے پاس نہیں ہے

انسان خطا کا پُتلا ہے اسی سے غلطی سرزد ہوتی ہے لیکن میر صاحب اسے کوئی بری بات نہیں بتاتے۔ ان اشعار کے تیور ملاحظہ فرمایئے ؎

یکا یک یوں نہیں ہوتے ہیں پیارے جان کے لاگو   کبھو آدم ہی سے ہو جاتی ہے تقصیر بھی آخر

در پے خونِ میر ہی نہ رہو   ہو بھی جاتا ہے جرم آدم سے

"تائیدِ آسمانی" کے بغیر کسی کام میں کامیابی حاصل کر لینا قدرے مشکل ہے ؎

کعبے گئے کیا کوئی مقصد کو پہنچتا ہے   کیا سعی سے ہوتا ہے جب تک نہ خدا چاہے

آہ لاکھ "تیر و تبر" سے زیادہ کام کرتی ہے اور اس میں بلا کا اثر ہوتا ہے ؎

غافل نہ رہو آہ ضعیفوں سے سرکشاں   طاقت ہے اُس کو یہ کہ جہاں کو جلا سکے

کبیر کا مشہور شعر ہے ؎

دُربل کو نہ ستائیو، جا کی موٹی ہائے   موئی کھال کی سانس سے سار بھسم ہو جائے

یہ بات زبان زدِ خاص و عام ہے کہ دوا سے زیادہ دُعا میں تاثیر ہوتی ہے ؎

تاثیر ہے دُعا کو فقیروں کی میر جی   ٹک آپ بھی ہمارے لئے ہاتھ اُٹھایئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یک وقتِ خاص ہی میں مری کچھ دعا کرو — تم بھی تو میرؔ صاحبِ قبلہ فقیر ہو

محبت وہ ہے جو نبھائی جا سکے اور اسی سے وہ لطف مل سکتا ہے جو سکون کہلاتا ہے ؎

لطف کیا ہر کسو کی چاہ کے ساتھ — چاہ وہ ہے جو ہو نباہ کے ساتھ

رجب علی بیگ سرورؔ نے "انشائے سرور" رقعہ ۲۶ میں لکھا ہے :-

"سب ملتے ہیں چاہنے والا نہیں ملتا۔ ترک سہل ہے۔ نباہنے والا نہیں ملتا۔"

اسی ضمن میں اُردو کے ایک مشہور شاعر نے کہا ہے ؎

یہ دُنیا ہے یہاں دل کا لگانا کس کو آتا ہے — ہزاروں پیار کرتے ہیں، نبھانا کس کو آتا ہے

مصیبت کی قدر مصیبت زدہ ہی جانتا ہے اور عشق و محبت کی حقیقت سے صرف وہی واقف ہے جس کا دل کسی کی زلفوں کا اسیر ہو اور اُسی کو اس کی لطف انگیزیاں حاصل ہوتی ہیں ؎

آزار کھینچنے کے مزے عاشقوں سے پوچھو — کیا جانے وہ کہ جس کا کہیں دل لگا نہ ہو

نظیریؔ کا یہ شعر یہاں صادق آتا ہے ؎

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را — نوا گرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

ہر انسان کا نوشتۂ تقدیر علیحدہ علیحدہ ہے ؎

بشیخ جنت تجھے ، مجھے دیدار — واں بھی ہر اک کی ہے جدا قسمت

جب تک زندگی ہے اس دنیائے آب و گِل میں سُکھی یا دُکھی بہر صورت رہنا ہے۔ زندگی ان دونوں صورتوں میں سے ایک صورت میں ضرور گذارنی پڑتی ہے لیکن اس دُنیا سے دوسری دنیا میں جانے سے پہلے ایسے کام کرنے چاہئیں جن کی بدولت مرنے کے بعد بھی مرنے والا یاد آتا رہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اور اس کے نیک کاموں یا خوبیوں کی یاد تازہ ہوتی رہے اور ایسی بات نہ ہو کہ لوگ اس کا نام لینا ہی شرم، بدنامی اور ذلت کا باعث سمجھیں۔ میرؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بامے دُنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو — ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

اور ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

سب کام سونپ اس کو جو کچھ کام بھی چلے — جب نام اس کا صبح کو تا نام بھی چلے

مُلّا وجہی نے "قطب مشتری" میں فرمایا ہے ؎

دُنیا میں توں آیا تو کچ نام کر — خدا کوں جو بھاتا ہے سو کام کر

کبیر نے بھی کیا خوب کہا ہے ؎

جو تو آیا جگت میں جگت سراہے تو ئے — ایسی کرنی کر چلو، پاچھے ہنسی نہ ہوئے

کسی چیز کو انسان اُسی وقت حاصل کرسکتا ہے جب وہ خود کو اس کی جستجو میں ضم کردے۔ والہ جب اپنے آپ کو فنا کردیتا ہے تو اسی کی وجہ سے ہر ابھرا گلزار نظر آنے لگتا ہے ؎

محو کر آپ کو یوں ہستی میں اُس کی جیسے — بوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

انسان کو سوچ سمجھ کر بات کہنی چاہیے اور بغیر سوچے سمجھے زبان نہیں کھولنی چاہیے۔ کسی بات کا اسی وقت اثر ہوتا ہے جب یہ غور و خوض کے بعد کہی جاتے۔ اس لئے میرؔ کہتے ہیں ؎

ہونٹ اپنا ہلا نہ سمجھے بن — یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ

اس لئے کہ اگر زبان بے محل کھولی گئی تو اس میں خطرہ کا امکان ہوتا ہے جس کی طرف ایک فارسی شاعر بہائی نے اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

نگہدار از بیش گوئی زباں — کز افزونئ نقطہ گردد زیاں

یہ مشاہدہ ہے کہ اگر زندگی کے دن شروع سے اخیر تک ایک ہی طرح گذار دے جائیں تو ہر انسان کی اس دُنیا میں اچھی نبھ جاتی ہے کیوں کہ ہر انسان پر اچھے یا بُرے دن آتے رہتے ہیں۔ اگر دولتمندی کے زمانہ میں گلچھرے اڑا دیے جائیں اس لئے کہ اس وقت روپے پیسے کی ریل پیل ہوتی ہے لیکن اگر ناداری کا زمانہ آجائے تو اس وقت کس طرح سے عزت کے ساتھ زندگی گذاری جاسکے گی۔ اس لئے یہ بڑا اچھا اصول ہے کہ زندگی کو ایک رنگ میں ڈھال لیا جائے اور اسے یکساں طور پر گذارا جائے تاکہ آڑے وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کسی قسم کی ذلّت کا سامنا نہ کرنا پڑے ؎

ہر اک سے ڈھب جُدا ہے، سارے زمانہ کا بھی
بنتی ہے جس کسو کی یک طور پر بنے گی

اخلاقی بلندی ملاحظہ ہو ؎

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

———— میر صاحب نے سبحہ و زنار کی جکڑ بندیوں سے بے نیازی سکھلائی ہے۔ انھوں نے ہمیں خود غرضی، ظلم، غرور، برائی، تعصب، لالچ اور حسد وغیرہ اخلاقی کمزوریوں کو ترک کرنے کا سبق دیا ہے اور حقیقت میں یہی وہ "امراض" ہیں جو ایک انسان کی راہ ترقی میں حائل ہوتے ہیں اور اُسے منزل مقصود تک پہنچنے نہیں دیتے۔ انھیں حقائق شناسی کی وجہ سے ان کی لَے میں آفاقی نغمہ ہے، ان کی آواز میں کائنات کی صدا مضمر ہے اور ان کے دل میں ساری دُنیا کا درد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنگ دُنیا سے نکل کر اتنی وسیع و عریض دُنیا میں پہنچ گئے ہیں جہاں مروّت اور دردمندی پنپتی نظر آتی ہیں اور فی الواقع ان کی عظمت کا ایوانِ رفیع بھی انھیں ابدی سچائیوں پر قایم ہے جن کی آب و تاب میں کبھی بھی کوئی کمی نہیں آئے گی اور ظاہر ہے کہ انسان انسان کی دوا ہے۔ میر صاحب نے ٹھیک کہا ہے ؏ دردمندی ہی تو ہے جو کچھ کہ ہے

آخر کار ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ میر کے فلسفۂ اخلاق میں آفاقیت بھی ہے اور دنیاوی ہوشمندی بھی، انھوں نے اُن اخلاقی اقدار پر زور دیا ہے جو نہ صرف انھیں عزیز تھیں بلکہ وہ آج بھی عزیز ہیں اور ان کی آفاقی قدر و قیمت میں کبھی کوئی فرق نہیں آئے گا۔ دردمندی، انسانی فضیلت، کُشادہ دلی، رواداری، نیکی، انسانیت اور انسان دوستی وغیرہ ایسی دائمی قدریں ہیں جن پر نہ صرف دنیا کا امن قائم ہے بلکہ نظامِ کائنات کا دار و مدار انھیں قدروں پر ہے ———— اور یہی زندگی کی صداقتیں ہیں جو قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں اور ہمارے دکھی دلوں پر مرہم کا کام کرتی ہیں۔ اس لئے انسان کامل اُسی وقت بنتا ہے جب اس میں اخلاقی خوبیاں ہوں "ذکرِ میر" میں درحقیقت کیا لاجواب بات کہی ہے کہ "تا آدم اخلاق پیدا نہ کند، انسان نہ شود" اس واسطے انسان بننے کے لئے پہلی شرط اخلاق ہے اور جس میں اخلاق ہے وہ تمام خوبیوں کا گنجینہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میر کے دل میں دردمندی اور طبیعت میں

© rasailojaraid.com